قدرت اللہ شہاب: ایک عبقری شخصیت

ڈاکٹر اصغر حسن سامون
پرنسپل سیکریٹری
محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت جموں و کشمیر

[اگرچہ قدرت اللہ شہاب کی شہرت زیادہ تر اُن کی سوانحی دستاویز "شہاب نامہ" کی وجہ سے ہے لیکن شہاب اپنے افسانوں اور کچھ دیگر تحریروں کی وجہ سے بھی ادبی تاریخ کا حصہ ہے، بحیثیت ایک اعلیٰ بیوروکریٹ کے بھی اُن کی نگارشات کو انتہائی مشاہدے اور تجربے کی چیز گردانا جاتا ہے۔ مزکورہ مضمون میں جہاں شہاب کی سوانح عمری کا سرسری خاکہ کھینچا گیا ہے وہیں اُن کے دو مشہور افسانوں 'ماں جی اور یا خدا' کے بارے تفصیلی بحث ہوئی ہے۔]

قدرت اللہ شہاب کا شمار ایسی بلند قامت وہمہ جہت شخصیات میں ہوتا ہے، جن کو مختلف شعبہ ہائے حیات میں نمایاں کارنامے انجام دینے کی بناء پر شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل ہے۔ بحیثیتِ مصنّف، شہاب اُردو کے اعلیٰ درجے کے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت کم افسانے لکھے، لیکن جو کچھ لکھا، اُس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ لکھنے کا آغاز انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی کیا تھا، جب عالمی سطح پر مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوا تھا۔ مقابلے میں دنیا کے مختلف حصوں سے بے شمار مضامین جائزہ کمیٹی کو موصول ہوئے تھے۔ اُس مقابلے میں قدرت اللہ شہاب نے اوّل درجہ حاصل کیا تھا۔

ریاست کے سرمائی دارالخلافہ جموں سے تعلق رکھنے والے قدرت اللہ شہاب کی ولادت یکم جنوری ۱۹۲۰ء (اسکول ریکارڈ ۲۶ رفروری ۱۹۱۷ء) کو گلگت میں ہوئی۔ گلگت میں اُن کے والد محمد عبداللہ وزیر وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ شہاب کی ابتدائی تعلیم اکبر اسلامیہ ہائی اسکول جموں میں ہوئی، جس کے بعد وہ چمکور صاحب نامی قصبے کے خالصہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور پنجاب یونیورسٹی کے منعقدہ میٹرکولیشن کے امتحان میں اوّل درجہ حاصل کیا۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے پرنس آف ویلز کالج جموں سے ایف ایس سی کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی کی ڈگری امتیازی پوزیشن کے ساتھ حاصل کی۔ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا۔ اس بنا پر اُن کو ریاست جموں و کشمیر کا پہلا مسلم آئی سی ایس افسر ہونے کا اعزاز و افتخار بھی حاصل ہے۔ ۱۹۴۱ء سے لے کر ۲۰ رفروری ۱۹۷۵ء تک وہ مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر کام کر کے وفاقی سیکریٹری وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان کے عہدے تک پہنچے اور پھر وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ ۲۴ رجولائی ۱۹۸۶ء کو شہاب اسلام آباد، پاکستان میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اُردو ادب کے ساتھ شہاب کو بچپن ہی سے قلبی وابستگی تھی اور انہوں نے چودہ پندرہ سال کی چھوٹی عمر میں ہی اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر ذوقِ مطالعہ کے ذریعے اُردو زبان و ادب میں گہرا شغف پیدا کر لیا تھا۔ سولہ یا سترہ سال کی عمر میں انہوں نے پرنس آف ویلز کالج کے میگزین ''توی'' کے شعبہ اُردو کے مدیر کی حیثیت سے شیلے اور کیٹس کی بعض نظموں کے کامیاب اُردو تراجم شائع کئے۔ اُردو شعر و ادب کے ساتھ اُن کا یہ رشتہ دن بہ دن مضبوط تر ہوتا گیا اور اپنے انتقال کے وقت شہاب ایک اعلیٰ پایہ کے بیوروکریٹ کی بہ نسبت اُردو ادب کے ایک تابناک ستارے کی حیثیت سے زیادہ شہرت پا چکے تھے۔

جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے، شہاب کا اوّلین افسانہ ''چندراوتی'' تصور کیا جاتا ہے، جو انہوں نے ۱۸ سال کی عمر میں ۱۹۳۸ء میں لکھا اور یہ افسانہ اختر شیرانی کے ہفت روزہ ''رومان'' میں شائع ہوا۔ قرۃ العین حیدر نے ایک جگہ اعتراف کیا ہے کہ شہاب کا یہ افسانہ پڑھ کر ہی اُن کو لکھنے کی تحریک ملی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد شہاب کو لاہور کے مشہور رسالے ''ادبی دنیا'' کے مدیر صلاح الدین احمد نے ''طنزیہ افسانہ نگار'' کے طور پر متعارف کیا، جس کے بعد اُن کے افسانے یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتے گئے۔

شہاب کے اہم اور مشہور افسانوں میں 'یا خدا' اور 'ماں جی' کے علاوہ پکے پکے آم، دورنگا، سب کا مالک، اے بنی اسرائیل اور عائشہ آئے گی، چمکور صاحب، صنم پلکیت، جال، کٹی ہے رات تو..... نمبر پلیز، آثار قدیمہ، پھوڑے والی ٹانگ، سٹینو گرافر، شلوار، جگ جگ آیا، تلاش، جلترنگ، لے دے، کراچی، آپ بیتی، غم جاناں، سرخ فیتہ، ایک ڈسپیچ، اقبال کی فریاد، غریب خانہ، سب کا مالک، ماما، پہلی تنخواہ اور ڈاگی وغیرہ شامل ہیں، جو اُن کے کئی افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔

اُردو کے افسانوی، غیر افسانوی اور سوانحی ادب میں قدرت اللہ شہاب کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ شہاب کے افسانے ہوں یا اُن کے خاکے، انشائیے اور مکالمے ہوں یا سفر نامے یا اُن کی شہرۂ آفاق اور معرکتہ لآراء خود نوشت سوانح ''شہاب نامہ''، ہر جگہ شہاب گوناگوں خصوصیات کے طفیل اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ شہاب کے شاہکار فن پاروں میں ''شہاب نامہ'' کے علاوہ چند اور افسانوں کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جن میں ''یا خدا'' اور ''ماں جی'' خاص طور پر شامل ہیں۔ ''یا خدا'' کو شہاب کی تخلیقات میں نہایت منفرد مقام حاصل ہے اور ''ماں جی'' کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کا یہ نپا تُلا تبصرہ ہی کافی ہے کہ ''شہاب اگر ''ماں جی'' کے سوا کبھی کوئی چیز نہ لکھتا، تو جب بھی ادب اُسے صدیوں تک فراموش نہ کر سکتا۔'' اگر یوں کہا جائے تو شائد بے جا نہ ہوگا کہ بطورِ افسانہ نگار شہاب کی شہرت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا انحصار اُن کے طویل افسانہ ''یا خدا'' اور مختصر افسانہ ''ماں جی'' پر ہے۔ یہ دونوں افسانے اپنے مزاج اور تہذیبی حوالوں کے اعتبار سے شہاب کے باقی افسانوں سے بہت مختلف ہیں اور اُن کے اپنے مزاج سے زیادہ قریب ہیں۔

افسانہ ''ماں جی'' ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا اور ۱۹۶۳ کے نقوش، لاہور کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانے میں شہاب نے اپنی والدہ کو مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سب واقعات اور تفصیلات حقیقی ہیں، اِن کو بیان کرنے کا انداز، البتہ افسانوی ہے یعنی ان کی ترتیب سے ایسی صورت پیدا کی گئی ہے، جو حقیقت سے زیادہ افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے چھوٹے

چھوٹے ٹکڑے یوں جوڑے گئے ہیں کہ ان سے ماں جی کا کردار اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ یقیناً ایک فرد کا کردار ہے۔ اس کے باوجود انفرادی سطح سے بلند ہو کر یہ کردار ایک عہد کا ترجمان اور مخصوص اخلاقی اقدار کی علامت بھی ہے۔ جن عوامل کے زیر اثر ایسے کردار متشکل ہوتے ہیں اور اُن میں ایسی اخلاقی اقدار پیدا ہوتی ہیں، وہ اب تہذیبی و سماجی سطح پر نظر نہیں آتے۔ گردشِ ایام نے انہیں قصۂ پارینہ بنا دیا ہے۔ ان کی بازآفرینی سے البتہ ہمارے دل و دماغ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے، جس میں اپنے گم کردہ سرمایے پر شدید غم جھلکتا ہے۔ یہی افسانہ ''ماں جی'' کے تاثر کا راز ہے۔ افسانہ نگار نے اس میں کوئی عبارت آرائی نہیں کی ہے، نہایت سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ گزرے وقتوں کی کہانی سنائی ہے۔ طرزِ بیان بھی اتنا ہی سادہ ہے، جتنا کہ ماں جی کا کردار۔ شاید اسی لئے شہاب نے اثر انگیزی کیلئے کسی مصنوعی سہارے کی ضرورت محسوس نہیں کی، خود ماں جی کا کردار اور اس سے وابستہ تفصیلات ہی ایسی ہیں کہ افسانہ پُر اثر ہو جاتا ہے۔

''ماں جی'' کو ایک لحاظ سے کرداری افسانہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شہاب نے اس میں اپنی ماں کی قلمی تصویر کھینچی ہے۔ ایک ایسی تصویر، جس میں سبھی رنگ موجود ہیں۔ اس میں ماں جی کی نوعمری کی جھلک بھی نظر آتی ہے، جوانی کی بھی، بڑھاپے کی بھی اور پھر اچانک دنیا سے روٹھ جانے کا منظر بھی سامنے آتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ شہاب نے ''ماں جی'' کے کردار کو ارتقاء پذیر ہوتے، اپنے عروج پر پہنچتے اور پھر بکھرتے ہوئے دکھایا ہے۔ مگر ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ پورے افسانے میں ایسی کوئی تفصیل نہیں جس سے ماں جی کا ناک نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔ سب تفصیلات کا انتخاب صرف ایک مقصد کے پیش نظر کیا گیا ہے کہ ماں جی کے نہ رہنے سے کیا نہیں رہا، خود شہاب کیلئے اور قارئین کے لئے۔ وہ کیا تھا جس کی ماں جی زندہ علامت تھی، وہ طرزِ زندگی اور وہ اقدار جن کی ماں جی چلتی پھرتی تصویر تھیں، ان کا مٹ جانا ہی اصل المیہ ہے اور اسی المیہ کا اظہار سارے افسانے کا نچوڑ ہے۔

ماں جی کا اصل نام کریمہ بی بی تھا۔ وہ انیسویں صدی کے آخری برسوں میں پیدا ہوئیں۔ لگ بھگ ۸۰ برس کی عمر میں مارچ ۱۹۶۲ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ سارے خاندان میں ماں جی کے ساتھ شہاب ہی کا سب سے زیادہ عرصہ گزرا۔ شہاب کی زندگی میں ماں جی کو نہایت خاص اور نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ ''شہاب نامہ'' کے صفحہ نمبر ۹۹۹ پر ماں جی کی تصویر اور کتاب کے صفحات ۳۲، ۳۱۵، ۳۱۶، ۱۰۰۷ اور ۱۰۱۹ پر ماں جی کا جس انداز میں تذکرہ آیا ہے اُس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ شہاب کو اپنی والدۂ معظّمہ کے ساتھ بے حد جذباتی وابستگی تھی۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں ماں جی کو کراچی میں دفن کرنے کے بعد جب شہاب واپس اپنے دفتر ایوانِ صدر راولپنڈی پہنچتے ہیں تو غم سے نڈھال دفتر میں بیٹھے اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور فائلیں بھیگ جاتی ہیں۔ اس منظر کو شہاب نے کچھ یوں قلم بند کیا:

> ''ایک روز نہ جانے دل میں کیا اُبال اٹھا کہ فائلیں میز پر جمع ہوتی رہیں اور میں ایک کاغذ پر سر جھکائے بے ساختہ ''ماں جی'' کے عنوان پر اُن کے بارے میں لکھتا رہا، لکھتے لکھتے آنکھوں سے بار بار آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرتے تھے اور کاغذ پر تحریر شدہ الفاظ کو بھگو کر لکیروں کی صورت میں پھیلا دیتے تھے۔۔۔دو

تین گھنٹے میں میری تحریر مکمل ہوگئی اور دل پھول کی پتی کی طرح ہلکا ہو گیا۔ ۔ ۔ میں نے اپنی ماں کی یاد کو الفاظ میں ڈھال کر کاغذ پر منتقل کر دیا ہے، اب یہ المیہ صرف میرا ہی غم نہیں رہا۔‘‘

(بحوالہ : شہاب نامہ صفحہ نمبر ۱۰۰۸)

شہاب کی اس کہانی یعنی ’’ماں جی‘‘ کے مطالعہ اور حقیقی ماں جی کے واقعاتِ زندگی کا موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس افسانے میں واقعات اور تفصیلات کو ان کے اپنے سیاق و سباق کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، تاہم ان سے جو تاثر قائم ہوتا ہے، اس میں اعلیٰ درجے کا فن جھلکتا ہے۔ شہاب نامہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ماں جی ضلع انبالہ میں منیلہ نامی گاؤں کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والدین کے پاس جو چند ایکڑ اراضی تھی، وہ نہر سرہند کی کھدائی میں ضم ہوگئی اور وہ کوئی معاوضہ بھی حاصل نہ کر سکے۔ ماں جی کے والد خیال بخش اپنے کنبے کو لے کر سفر پر نکل پڑے۔ راستے میں ماں جی اور اُن کی والدہ سوت کات دیتیں اور ان کے والد قلی کا کام کر لیتے۔ زندگی کے اس مشکل مرحلے میں ماں جی کے خاندان نے بڑی سختیاں جھیلیں، کھانے کو جو ملتا، صبر و شکر سے کھا لیتے۔ کبھی جنگلی میووں پر گزارہ کرتے، کبھی خربوزے کے چھلکے ابال کر کھا لیتے تھے۔ محنت مزدوری کرتے کرتے اُن کے پاس کچھ پیسے جمع ہو گئے اور ان کے اچھے دن لوٹ آئے۔

اسی دوران گاؤں کے ایک پڑھے لکھے نوجوان محمد عبداللہ، جو گلگت میں وزیر وزارت کے عہدے پر فائز تھے، چھٹیاں منانے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ ماں جی کی اُن سے شادی ہوگئی اور یوں وہ گلگت روانہ ہوگئیں۔ اس طرح ماں جی نے زمانے کے نشیب و فراز دیکھے، غریبی دیکھی، امیری دیکھی مگر اُن کے بنیادی مزاج میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہی وجہ ہے کہ ماں جی کا کردار زندگی کے بارے میں ایک روّیے کا آئینہ دار ہے، جو شہری صنعتی دور کے برعکس ایک زراعتی اور دیہاتی زمانے کی یاد ہے، جب انسانوں کے باہم مراسم مستحکم اور روایتوں کے پابند تھے، راستے متعین تھے۔ لوگ بہ رضا و رغبت ان پر سلامت روی سے چلتے تھے تصادم اور کشمکش نام کو نہ تھی۔ کم از کم زندگی کی عوامی سطح پر لوگوں کا عقیدہ راسخ تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اسبابِ دُنیا، جو اُن کے مصرف میں آئیں گے، ان کا انہیں حساب دینا ہے۔ اس لئے وہ کم سے کم پر گزارہ کرتے، شکر و صبر کو اپنا شعار بناتے اور زندگی سے یوں سرخرو گزر جاتے جیسے اس کی آلائشوں سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ تھا اور وہ ہوا کے جھونکے کی طرح آئے اور زمانے میں اپنی خوشبو بکھیر کر چلے گئے۔

افسانہ ’’ماں جی‘‘ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ استحکام، اعتقاد، امن و چین، انسانی تعلقات میں ٹھہراؤ، قناعت پسندی، صبر و شکر، اعتماد وہ قدریں ہیں، جو ماں جی کے کردار سے مترشح ہیں اور اب ہماری زندگی سے بڑی حد تک خارج ہیں۔ آج ہم جس شک و شبہ، نفسانفسی، بے چینی، آپا دھاپی، چھینا جھپٹی اور بے یقینی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، اس کے مقابلے میں وہ اقدار، جن کی علامت ماں جی کا کردار ہے، کتنی نکھری نکھری اور حسین لگتی ہیں مگر ان میں اور ہماری زندگی میں جو خلیج حائل ہے، اُسے پاٹا نہیں جاسکتا۔ آج ہمارے شہروں میں، قصبہ جات میں اور دیہات میں زر پسندی اور مادہ پرستی نے انسانوں کا قد گھٹا دیا ہے۔ ان کی زندگیوں سے وہ برکتیں اور نعمتیں اُٹھ گئی ہیں، جو ماں جی کے زمانے میں عام تھیں۔

مجموعی طور پر قدرت اللہ شہاب کے اس افسانوی شاہکار کے بارے میں بلاخوف وتردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ''ماں جی'' عالمی ادب کا ایک شاہکار افسانہ ہے، جو اردو افسانے میں ایک نئے موڑ کا آغاز ثابت ہوا، جس نے دنیائے اردو کے بے شمار افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔ بقول ڈاکٹر حنیف فوقؔ:

> ''... ماں جی کے دل موہ لینے والے کردار کی سادگی نے کردار نگاری کی تمام روایتوں سے الگ ہٹ کر خود اپنی ایک دل نشین روایت کی ابتداء کی ہے۔ اس افسانہ میں قدرت اللہ شہاب کی مثالیت حیرت انگیز طور پر حقیقت کے قالب میں ڈھل گئی ہے اور دونوں کے کرشمۂ امتزاج سے تہذیب کی ساری پیچیدگیوں پر حاوی جو بصیرت اُبھرتی ہے، وہ موت کو بھی زندگی کی ظفر مندی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اسی لئے اس کا انجام ایک سادہ اور باوقار زندگی کے خاتمہ کا غم رکھتے ہوئے بھی المنا کی کا حامل نہیں ہے، بلکہ زندگی کے حسن تکمیل کی سعادت لئے ہوئے ہے۔''

شہاب کا دوسرا بڑا کارنامہ افسانہ ''یا خدا'' کی تخلیق ہے:

شہاب ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے اپنی دو ہی چیزیں پسند ہیں۔ ایک 'ماں جی' اور دوسرا 'یا خدا'۔ یہ دونوں افسانے نہیں ہیں، یہ میرے مشاہدات ہیں جنہیں میں نے افسانوی رنگ میں لکھا ہے۔ 'ماں جی' میری والدہ ہیں، جن سے میں بے پناہ متاثر تھا۔ 'یا خدا' کے کردار مجھے ۱۹۴۸ء میں جا بجا ملے''۔ میں نے ان سب کو 'یا خدا' میں جمع کر دیا۔ یہ میرا طویل افسانہ ہے، جسے میں نے ایک ہی نشست میں لکھا۔''
>
> (قومی زبان، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۶ء ص ۱۵۵—۱۵۶)

''یا خدا''، تقسیم کے دنوں کے فسادات پر لکھا گیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار دلشاد ایک جوان عورت ہے۔ وہ مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب اور پھر کراچی پہنچتی ہے۔ وہ مختلف لوگوں کے ہاتھوں لٹتی ہے، یہاں تک کہ اس کے دل میں احساس زیاں باقی نہیں رہتا۔ شہاب نے ان لوٹنے والوں اور اس لُٹنے والی کی داستان اتنی حقیقت پسندی اور اتنے دکھ سے بیان کی ہے کہ قارئین کے دل و دماغ پر المیہ کا اثر مرتسم ہوتا ہے۔ اس المیہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک دلشاد کی ویران جوانی اور اجڑی ہوئی دنیا، دوسرے مختلف سطحوں پر بے حسی اور بربریت کا عنصر، جس کے سامنے انسانی عظمت اور شرافت کے سب دعوے جھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔

فسادات کے موضوع پر لکھے گئے تمام اُردو افسانوں میں ''یا خدا'' سب سے دلدوز اور اثر آفریں افسانہ ہے، جس کا ذکر ہر دور کی ادبی تاریخ اور تنقید میں بار بار ہوتا رہے گا۔ بعض ادباء نے اسے ناولٹ کہا ہے، بعض نے افسانہ قرار دیا ہے، ادب کے ناقدین کی اکثریت اس کو ناول تسلیم کرتی ہے لیکن خود شہاب اسے ایک طویل افسانہ مانتے ہیں۔ اگر اسے ناول تسلیم کر لیں تو یہ بات بلاخوف وتردد کہی جاسکتی ہے کہ ''یا خدا''، برصغیر کی تقسیم کے موضوع پر ایک منفرد ناول ہے، جس میں مصنف نے ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے صرف ان اقدار کو اجاگر کیا ہے، جو غیروں اور اپنوں کے ہاتھوں پامال ہوئیں۔

'یا خدا' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے، جو ۱۹۴۷ء کے تقسیمِ ملک اور اس کے ساتھ ہی پھوٹ پڑنے والے بدترین فسادات کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے اور وحشت و درندگی کے ننگے ناچ میں اپنا سب کچھ کھو کر پاکستان پہنچ جاتی ہے۔ یہاں آ کر بجائے اس کے کہ اس مظلوم و مقہور لڑکی کے مصائب کا خاتمہ ہوتا، وہ نئی مصیبتوں میں پھنس جاتی ہے اور ہوسناک نظروں کی شکار ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر حنیف فوقؔ:

> ''حقیقت یہ ہے کہ 'یا خدا' کے مختصر دائرے میں اُس وقت کی پوری زندگی سمٹ آئی ہے۔ برصغیر کی تقسیم، فسادات، ہجرت اور نئے ملک کی نئی زندگی میں حالات و تصورات کے تصادم کو قدرت اللہ شہاب نے جس معروضیت اور سچائی سے پیش کیا ہے، وہ اسے نہ صرف اپنے وقت کی وہ مستند دستاویز بنا دیتا ہے جس میں اس معاشرے کے سارے رنگ نمایاں ہو گئے ہیں، بلکہ اسے ادبی طور پر بھی ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ کا درجہ دیتا ہے''۔

''یا خدا'' کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بے لاگ صداقت کے ساتھ ساتھ انسانی سوز و دردمندی کی جو کیفیت ملتی ہے، وہ اسے ایسا شاہکار بنا دیتی ہے کہ اس میں متاثر ہونے کے باوجود اسے گرفت میں لانا آسان نہیں ہے۔ ''یا خدا'' میں شہاب نے ظلم کو ظلم کی سطح پر دیکھا ہے اور ہمدردی کی ذرا سی رمق بھی پیدا نہیں ہونے دی ہے۔ بقول انور سدید:

> ''اس افسانے میں گہری اور کٹیلی طنز کو اہمیت حاصل ہے، جو افسانے کے گہرے تاثر کو ابھار دیتی ہے۔ چنانچہ اس دور میں (جب) ترقی پسند افسانہ فسادات کو پھیکے اور مصنوعی کرداروں کے وسیلے سے پیش کر رہا تھا، قدرت اللہ شہاب نے حقیقت کی جراحت کو مجسم کر دیا اور اپنی طنز سے کسی کو بھی بچ نکلنے کا موقع نہیں دیا''۔

اس کہانی میں محض الفاظ نہیں، جذبات نہیں، کھلا طنز نہیں، ظاہری تلخی اور بغاوت نہیں، بلکہ بلا کا اثر بھی ہے۔ اس میں ایسے طبقوں پر زبردست طنز ہے، جو مصیبت زدہ پناہ گزینوں سے رسمی ہمدردی جتاتے ہیں اور اپنی امداد و خیرات پر بے حد خوش ہیں۔ شہاب کے علاوہ لکھے گئے دیگر فسادات کے افسانوں میں بالخصوص ترقی پسندوں نیا الفاظ کا ملبہ تو جمع کر دیا تھا لیکن تاثر کو سیاست کی نذر کر دیا تھا اور مصنوعی قسم کا توازن پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ شہاب نے اس کے برعکس ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں فسادات کا توازن قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ فسادات کے المیے سے اس حقیقی افسانے کو تلاش کیا، جس کے جرائم میں اپنے اور پرائے برابر کے شریک تھے۔ اس جرم کی انتہا یہ تھی کہ ''یا خدا'' کے مرکزی کردار دلشاد پر مکمل بے حسی طاری ہو گئی اور عصمت کے لٹ جانے کا احساس ہی زائل ہو گیا۔ اس کی روح مر گئی اور پھر بقول ممتاز شیریں : ''یا خدا'' صرف دلشاد کی ٹریجڈی نہ رہی، بلکہ ہزاروں لاکھوں عورتوں کی ٹریجڈی بن گئی''۔

شہاب کی دیگر کہانیوں میں 'پکے پکے آم' بھی اہم ہے، جس میں شہاب نے کشمیر کی غربت کو موضوع بنایا ہے، جب کہ 'دورنگا' میں ریاست جموں و کشمیر کا ماحول پس منظر کے طور پر کام کرتا ہے اور افسانہ کے سبھی کردار ریاستی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی

نمائندگی کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ افسانہ ریاست کے ایک ایسے کردار کا افسانہ ہے، جس نے غربت کی گود میں امارت کے خواب دیکھے۔ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے وسائل تلاش کئے لیکن پھر اپنے فنی علم کو تعمیراتِ عامہ میں استعمال کرنے کے بجائے حصولِ دولت کے لیے کام میں لانے لگا۔ یہ کردار ظاہر اور باطن کے تضاد سے تخلیق کیا گیا ہے اور کشمیر کی ڈوگرہ ریاست میں نمونے کے کردار کی حیثیت رکھتا ہے، جس کو افسانے کا موضوع بنانے کی شہاب کے بغیر کسی کو جرآت نہ ہوئی۔

'پکے پکے آم' کی طرح 'پھوڑے والی ٹانگ' میں بھی ریاست جموں وکشمیر میں استحصالی نظام ہی افسانے کا مرکزی موضوع ہے۔ یہ اس تاثر وتبصرہ کا حصہ ہے، جو شہاب نے اپنے افسانوں میں ریاست میں ڈوگروں کے استحصالی نظام پر رقم کیا ہے۔

'صنم پلکیت' میں تبتی دیومالا، رسم ورواج، لوک کہانی اور قدرتی ماحول کو نفسِ افسانہ کے اظہار کے لیے جس چابکدستی سے شہاب نے استعمال کیا ہے، وہ ان کے تخلیقی جوہر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ 'جال' میں دو عاشقوں چارو اور نرملا کو انتہائی مختلف ماحول میں وسوسوں، اندیشوں اور حسرتوں کا شکار دکھایا گیا ہے۔ 'تین تارے' وہ افسانہ ہے، جس میں تین حسین وجوان عورتوں کی تصویریں ہیں اور ہر تصویر کا جداگانہ رنگ اور ماحول ہے۔ افسانہ 'نمبر پلیز' میں طنز ومزاح کے امتزاج کے ساتھ انسانی کمزوریوں کا مشاہدہ اور اس سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے پر لطف قصے ہیں۔ 'شلوار' میں متوسط طبقے کے ایک گھر کا ماحول ہے، جس میں رشیدہ، جمیلہ اور نسیم نام کے تین کردار ہیں۔ 'شلوار' کا ہی موضوع شہاب کے ایک اور افسانے 'جلترنگ' میں ایک مختلف انداز اور ماحول میں پیش کیا گیا ہے۔

'ڈاگی' کا مرکزی کردار فریدہ نام کی ایک نوجوان عورت ہے، جب کہ 'سٹینو گرافر' کا مرکزی کردار بھی ایک جوان لڑکی 'گریسی' ہے جو اپنے کام میں مستعد ہونے کی وجہ سے دفتر میں بھرتی ہوئی تھی۔ 'ریلوے جنکشن' کا موضوع طوائفوں کی زندگی سے متعلق ہے، جب کہ 'جگ جگ' کا موضوع بھی جنس ہی سے متعلق ہے، ایسی جنس جو فراوانی سے کلکتہ کے ہوٹلوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں آوارہ پھرتی ہے۔

'ڈسپیچ'، 'پکے پکے آم' اور 'پھوڑے والی ٹانگ' شہاب کے ایسے تین افسانے ہیں، جن کو تسلسل میں پڑھا جاسکتا ہے۔ اس تسلسل کا انحصار بڑی حد تک ایک غیر ملکی کردار رابرٹ لانگ پر ہے، جو تینوں افسانوں میں موجود ہے۔

'ماما' میں ایک بوڑھی خادمہ کی صورتحال کو موضوع بنایا گیا ہے، جو غریبی اور غریبوں کے مسائل میں الجھی ہوئی زندگی کی تصویر سے متعلق ہے، جب کہ افسانہ 'غریب خانہ' میں قحط، غربت، بھوک، جنس اور استحصال سبھی موضوعات جمع ہو گئے ہیں۔ افسانہ 'سب کا مالک' میں قحطِ بنگال کا زمان اور نندی گرام کا مقام سامنے آتا ہے۔

'اور عائشہ آ گئی'، 'سفر نامے'، 'اے بنی اسرائیل' اور '۱۸ سول لائنز' وہ افسانے ہیں، جن کی بدولت شہاب کی ادبی شخصیت کی قدوقامت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ 'اور عائشہ آ گئی' کے مرکزی کردار کے طور پر تین نام سامنے آتے ہیں : عبدالکریم، اس کی بیوی اور اس کی بیٹی عائشہ۔ ان کے ارد گرد کئی مناظر اور چھوٹے چھوٹے واقعات اور ان سے متعلق کردار بھی ہیں، مگر کہانی کا تاثر عبدالکریم اور اس کے مختصر خاندان کے حوالے ہی سے قائم ہوتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے افسانوں میں کرداروں اور واقعات کو ایک دوسرے کے مقابل لاکر گہرے معنوی نتائج کی طرف

اشارہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر فوق: ''ان کے بعض افسانے مثلاً چمکور صاحب مقررہ افسانوی حدود کو توڑ کر نئی سرحدوں کی دریافت کا پتہ دیتے ہیں''۔ شہاب کی تحریروں میں جو ذہنی بلندی ملتی ہے، وہ انسان اور زندگی سے رابطہ قائم رکھتے ہوئے آج کے معاشرے کے اخلاقی زوال میں نئی سمتوں کا اشارہ بن جاتی ہے۔ ممتاز شیرین کے الفاظ میں:

> ''شہاب کا فن خاموش فن ہے۔ فن میں مقصد اس طرح ڈھکا رہتا ہے کہ ہم اُسے دیکھے بغیر محسوس کر سکتے ہیں، اس سے اثر لے سکتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیشہ ایک صحت منداخلاقی نظریہ ہوتا ہے۔ وہ وعظ اور نصیحت نہیں بنتا، بلکہ افسانے کے تبسم میں پنہاں ہوتا ہے، لیکن ہم محسوس کر لیتے ہیں 'تلاش'، 'غریب خانہ'، 'جگ جگ'، 'سب کا مالک' اور 'سٹینو گرافر' میں یہ احساس موجود ہے''۔

شہاب کے یہاں خوبصورت اور معیاری نثر کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، جس کے سبب ان کی انفرادیت ان کی تخلیقات میں جا بجا نظر آتی ہے۔ شہاب کا طنزیہ انداز اُن کے اکثر افسانوں میں تلوار کی کاٹ کا کام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدیر 'ادبی دنیا' نے اُن کو 'طنزیہ افسانہ نگار' قرار دے کر اُن کے افسانوں کے زندہ جاوید ہونے کی بہت پہلے پیش گوئی کی تھی، جو بعد میں درست ثابت ہوئی۔

ریاست جموں و کشمیر سمیت پوری اُردو دنیا میں میں قدرت اللہ شہاب کی شہرت و مقبولیت میں اُن کی وفات کے بعد اُس وقت سے مسلسل اضافہ ہوتا گیا، جب بیسویں صدی کی آخری دہائی کے وسط میں اُن کی دلچسپ تصنیف ''شہاب نامہ'' کتب فروشوں کے پاس فروخت کے لیے آ گئی۔ اِس کتاب نے بھاری ضخامت و قیمت [۱۱۰۰ صفحات؛ ۴۵۰ روپے ۱۹۹۴ء] کے باوجود برصغیر ہندو پاک کے کتب بازاروں میں اپنے زمرے کی کتابوں کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ کر رکھ دیئے اور کشمیر کی طرح غالباً پوری اُردو دنیا میں بیسٹ سیلر ثابت ہوئی۔ خود قدرت اللہ شہاب اور ان کی اہم تصانیف کی انٹرنیٹ پر بے پناہ شہرت کا ایک اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۶ء میں ان کی وفات کے ۳۲ سال بعد آج جب گوگل میں ان کو تلاش کیا جاتا ہے، تو تلاش کے حیران کن نتائج سامنے آتے ہیں۔ آج بھی لاکھوں لوگ ان کے اور ان کی کتابوں کے بارے میں جانکاری حاصل کر رہے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں سرکاری انتظامیہ کے اعلیٰ افسران سے لیکر عام پڑھے لکھے باذوق قارئین تک، ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ ملیں گے، جو شہاب نامہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے مندرجات و مشمولات کو لیکر عموماً بحث کرتے رہتے ہیں۔ عصرِ جدید میں کم ہی کوئی دوسری اُردو کتاب اِس قدر مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی ہے۔ شہاب کی اِس خود نوشت سوانح کے نرالے انداز و اسلوب سے متعلق اُردو وکی پیڈیا میں یوں لکھا ہے:

> ''شہاب نامہ میں نجی، جذباتی، رومانی، قلبی، روحانی، خاندانی، معاشرتی، سیاسی، تاریخی، دفتری، قومی، ملکی، بین الاقوامی، ذہنی، علمی ادبی اور نظریاتی غرض کہ ہر قسم کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ پھر معمولی بیروں، ملازموں اور موچیوں سے لے کر مشاہیر عالم اور مملکتوں کے سربراہان تک کا ذکر ہے، تاہم یہ قدرت اللہ شہاب کے منفرد طرز تحریر اور دلنشیں انداز بیان کا اعجاز ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے واقعات اور معمولی سطح کے افراد بھی قاری کے دل و دماغ میں سما جاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر شہاب صاحب کا کمال

اور احسان یہ ہے کہ انہوں نے صورتیں صفحۂ قرطاس پر یوں منعکس کر دیں ہیں کہ آنے والے زمانے اس سے بہت کچھ اخذ کر سکیں گے۔''

قدرت اللہ شہاب سے متعلق اردو ادب کے چند مشاہیر کی آراء انتہائی قابلِ غور ہیں۔جمیل الدین عالی لکھتے ہیں:

''شہاب صاحب کے متعلق یہ مشہور ہوا ہے کہ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد صوفی ہو گئے تھے یا صوفیانہ زندگی گزارنے لگے تھے۔ایک عینی شاہد کے طور پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کپڑوں میں سادگی اور داڑھی رکھ لینے جیسے ظواہر کی حد تک تو یہ درست ہے، ورنہ میں نے انہیں ہمیشہ (۱۹۵۹ء سے) ایک اہل اللہ اور عاشقِ رسولؐ پایا۔''

قدرت اللہ شہاب کے فرزند ثاقب شہاب رقمطراز ہیں:

''ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا اور یہ بڑی بات ہے، بہت بڑی بات۔کسی نے ایک بار مل کر اتنا ہی جان لیا، پہچان لیا جتنا کہ ان کے قریب رہنے والوں نے۔وہ اِس پہچان سے گھبراتے تھے، چُھپتے تھے۔شائد ان کو شرم سی آتی تھی کہ میرا ظاہر اور باطن کیوں ایک سا ہے، جب کہ اکثر لوگ منافقت اور جھوٹ اور فریب کے بھاری بھرکم اُوَر کوٹ پہنے ہوئے پھرتے ہیں۔''

مشہور ادیب وشاعر میرزا ادیب لکھتے ہیں:

''شہاب کا اپنا ایک انداز تھا، زندگی بسر کرنے کا، زندگی کے بارے میں سوچنے کا، اپنی سوچ کو الفاظ میں منتقل کرنے کا۔ان کا زندگی بسر کرنے کا انداز درویشانہ تھا۔ان کی سوچ کا انداز حقیقت پسندانہ تھا اور سوچ کو الفاظ میں منتقل کرنے کا انداز فنکارانہ تھا۔وہ ایک سچے اور پہنچے ہوئے انسان تھے۔ایک ایسے سچے اور پہنچے انسان، جس کا وجود ظاہر کرتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا اور انسان بھی خدا سے مایوس نہیں ہوا۔''

ڈاکٹر حنیف فوقؔ کا خیال ہے:

''قدرت اللہ شہاب اپنے زمانہ سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی ایسا اندازِ نظر رکھتے تھے، جو انہیں اپنے زمانہ کا ضمیمہ بن جانے سے محفوظ رکھتا تھا۔چاہے تو اسے باہمہ اور بے ہمہ ہونے کی صنعت کہہ لیجئے لیکن اس میں زمانہ سے نزدیکی اور دوری کی جو خصوصیت ملتی تھی، وہ محض خیال کی حد تک محدود نہیں رہتی تھی، بلکہ انہیں مثبت عمل کی طرف بھی مائل کرتی تھی۔ایک جانب وہ دنیاوی رفعت کی بلندیوں پر پہنچے اور دوسری جانب وہ اس رفعت کو بوسیدہ پیرہن کی طرح اُتار پھینکنے میں ذرہ بھر بھی تامل نہیں کرتے تھے۔''

معروف نقاد اور دانشور ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کا جائزہ اُن کی عملی زندگی کی جس جہت سے بھی لیں، وہ مجھے بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی نظر آتے ہیں۔(ان کے افسانوں) کا مجموعی تاثر ایک ناول جیسا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو جس جراحت آمیز روپ میں دیکھا تھا، وہ انہیں پورے برصغیر میں پھیلا ہوا نظر آیا اور وہ اس کے مختلف زاویے افسانوں میں ابھارتے چلے گئے اور اس سے زندگی کی جو مجموعی

تصویر سامنے آئی، اس میں ناول جیسی بھرپور کیفیت موجود تھی۔''

مختار زمن لکھتے ہیں:

''(قدرت اللہ شہاب کو) دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ صاحب کشمیری ہیں، آئی سی ایس کے آفیسر ہیں اور اتنے بڑے ادیب ہیں کہ بڑے بڑے ان کے سامنے پانی بھرتے ہیں اور آخری زمانے میں تو سفید داڑھی، سوتی کرتہ شلوار اور وضع قطع کی سادگی ایسی تھی کہ (دیکھ کر کسی کو) شبہ بھی نہ ہوتا کہ یہی مشہور و معروف قدرت اللہ شہاب ہیں، جن کے ہاتھ میں سرکاری قلم بھی ہے اور ادبی قلم بھی، اور دونوں جاندار ہیں۔''

یہ رائے ثناء الحق صدیقی کی ہے:

''قدرت اللہ شہاب صاحب دنیائے آب وگل میں تین حیثیتوں سے متعارف ہوئے۔ ایک بڑے آفیسر کی حیثیت سے، ایک ادیب کی حیثیت سے اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے۔ میں نے ان کو سب سے پہلے ایک ادیب کی حیثیت سے جانا اور سب سے بعد میں ایک اچھے انسان کی حیثیت سے پہچانا لیکن ان کی اس موخر الذکر خوبی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔''

ابن حسن برنی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''شہاب صاحب کی نورانی داڑھی اور چہرے پر طمانیت، سکون اور انکسار دیکھ کر آدمی ایسا مسحور ہوتا کہ یہ احساس ہی نہ ہوتا کہ یہ ایک ریٹائرڈ آئی سی ایس افسر ہیں، جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ نہ یہ کہ یہ ایک بہت شہرت رکھنے والے ادیب ہیں اور نہ یہ کہ دوسروں کی باتیں بہت توجہ سے سننے والے اور اپنی رائے دینے کے لیے بے چین نہ ہونے والے ایک بہت پڑھے لکھے اور بڑے انسان ہیں۔ بس یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک بہت اچھے آدمی سے مل رہے ہیں۔''

سردار محمد طاہر تبسم کا خیال ہے:

''قدرت اللہ شہاب ایک عہد، ایک ادارہ، ایک تحریک اور ایک چلتی پھرتی تاریخ تھے ان کے پسندیدہ کاموں میں تین کو بے حد شہرت ملی۔ ایک یہ کہ وہ اصول پسند اور اصول پرست تھے اور اصولوں پر کبھی سودے بازی نہیں کرتے تھے، بلکہ تین بار اصولوں کی خاطر اعلیٰ (عہدوں) سے استعفیٰ بھی دیا۔ ان کا دوسرا پسندیدہ عمل عمرہ کی ادائیگی تھا۔ جب کہ ان کی تیسری پہچان مختصر نویسی تھی، مگر اس کا معیار بلند ترین ہوتا تھا۔''

شہاب قدوائی کی رائے جداگانہ ہے:

''شہاب صاحب کی طنز میں اتنا تیکھا پن ہے کہ وہ سیدھے دل میں اُتر جاتا ہے...... (انہوں) نے اپنے کرداروں کی نفسیات کا بڑی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے، اس لیے سب کردار حقیقی اور سچے نظر آتے ہیں۔''

شہاب کے حوالے سے مزید گفتگو و تحقیق کے ہزاروں در وا ہیں۔ شہاب اور اس کی تحریروں پر ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔